صہیونیت اور اسرائیل
کا تاریخی پس منظر

انتخاب از محاضرات

علامہ زاہد الراشدی

تحریر و ترتیب

حافظ کامران حیدر

ناشر

الشریعہ اکادمی

کنگنی والا، گوجرانوالہ

کتاب: صہیونیت اور اسرائیل کا تاریخی پس منظر

انتخاب از محاضرات: مفکر اسلام مولانا ابو عمار زاہد الراشدی مدظلہ

تحریر و ترتیب: حافظ کامران حیدر (0335-4090996)

برقی اشاعت: نومبر 2023ء

ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

صہیونیت اور اسرائیل کا تاریخی پس منظر

فہرست عنوانات

1. یہودیت کا آغاز: 5
2. فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی: 7
3. قوم عمالقہ سے جہاد: 8
4. جالوت سے مقابلہ: 9
5. حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت: 11
6. حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت: 12
7. یہود کا ہدف عظیم تر اسرائیل: 12
8. بخت نصر کا فلسطین پر قبضہ: 13
9. یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں: 14
10. طیطس رومی کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی: 16
11. 638ء میں بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ: 16
12. مسلم یہودی تعلقات: 17
13. یہود کی یثرب میں آبادکاری: 17

14. حضور نبی کریم ﷺ سے یہود و نصاریٰ کا حسد: 18
15. یہود کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے حکمت عملی: 19
16. تاریخ کا ایک دلچسپ سوال: 20
17. مدینہ منورہ پہنچتے ہی اسلامی ریاست کا قیام کیونکر ممکن ہوا؟ 21
18. یہودی قبائل کی مدینہ منورہ سے جلاوطنی: 23
19. رسول اللہ ﷺ کی عظیم سیاسی حکمت عملی:..............................23
20. حضور نبی کریم ﷺ کی جنگی حکمت عملی:...............................24
21. غزوۂ خیبر: 25
22. یہود آج سے ایک صدی پہلے تک:.......................................26
23. تحریکِ صہیونیت: 27
24. یہودیت نسلی مذہب: 28
25. مسئلہ فلسطین کا پس منظر: 28
26. فلسطین میں آبادکاری کے لیے خلافت عثمانیہ سے درخواست:...........29
27. یہود اور برطانیہ کے درمیان بالفور معاہدہ:..............................32
28. فلسطین پر برطانوی اتحاد کا قبضہ: 33
29. فلسطینی زمین کی فروخت کے متعلق جید علماء کرام کا فتویٰ: 34

30. فلسطین پر فلسطینیوں کا حق:..35

31. اقوام متحدہ کے ذریعے اسرائیلی ریاست کا قیام:..........................36

32. 1967ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ:...........................37

33. اسرائیل کے بارے میں عالمِ اسلام کا موقف:...........................38

34. امریکہ: اسرائیل کا سب سے بڑا سہارا:..................................40

35. امریکہ میں یہود کا اثر و رسوخ:..41

36. یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت:.....................................42

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مذاہب دو دائروں میں تقسیم ہوتے ہیں: مذاہب سماویہ اور مذاہب غیر سماویہ۔ مذاہب سماویہ یعنی آسمانی مذاہب وہ ہیں جن کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے کسی سچے پیغمبر کی تعلیم اور آسمانی وحی پر ہے۔ سماوی مذاہب میں تین مسلمہ مذاہب ہیں: یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ آسمانی مذاہب میں سب سے قدیمی مذہب یہودیت ہے۔ یہودیت کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور تورات پر ہے۔

"یہودی" لفظ کی نسبت کس کی طرف ہے؟ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ نسبت حضرت یہوداہ کی طرف ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ان کی جو نسل چلی وہ یہودی کہلاتے ہیں۔ دوسرے مفسرین نے کہا کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد مذکور ہے: انا هدنا اليك۔ اے اللہ! ہم آپ کی طرف خلوص و اطاعت سے رجوع کرتے ہیں۔ هاد يهود کا معنیٰ ہے: رجوع کرنا، توبہ کرنا۔ اسی سے لفظ یہودی نکلا ہے کہ جنہوں نے کفر سے توبہ کر کے اس وقت کا اسلام قبول کیا تھا تو اس نسبت سے یہودی کہلائے۔

یہودیت کا آغاز:

بنی اسرائیل کا آغاز حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے ہوا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اصل وطن فلسطین تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل سے ہجرت کر کے فلسطین تشریف لے گئے تو فلسطین کو اپنا وطن بنایا۔ وہیں حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی، جن کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے

حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے حاکم بنے تو ان کی دعوت پر ان کا سارا خاندان مصر میں آ گیا تھا اور وہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ وہ حکومت صدیوں قائم رہی ہے۔

پھر جیسے دنیا کا قانون اور طریقہ ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ ایک وقت ان کے عروج کا تھا، پھر عروج کے بعد زوال کا وقت آیا تو زوال میں بنی اسرائیل فرعون اور قبطیوں کے غلام بن گئے۔ قبطی وہاں کی علاقائی قوم تھی۔ قبطیوں نے ان پر حکومت قائم کر لی اور بنی اسرائیل فرعون اور آل فرعون کے غلام بن گئے۔ بنی اسرائیل کا ایک دور یہ تھا۔

فرعون کسی شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ فرعون مصر کے حکمران کا خطاب ہوتا تھا، جس طرح ہمارے ہاں صدر اور بادشاہ کا خطاب ہوتا ہے یا جیسے عزیز مصر اور عظیم روم سردار کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ فراعنہ مصر کا نسل در نسل سلسلہ چلا ہے۔ یہ فراعنہ کا خاندان تھا جس نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد اور بنی اسرائیل ان کے غلام بن گئے۔ انہوں نے وہاں بہت مظالم برداشت کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نشوونما کو روکنے کے لیے فرعون نے ہزاروں بچے قتل کروا دیے تھے، کیونکہ اسے کسی نے بتا رکھا تھا کہ بنی اسرئیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو تمہارے لیے زوال کا باعث بنے گا، لیکن اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ہاں ہی پرورش پائی۔ جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا۔

فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی:

اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دینے کے بعد انہیں فرعون کے پاس بھیجا تو یہ مشن دے کر بھیجا کہ تم نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنا ہے اور اپنے وطن واپس جانا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اللہ تعالیٰ کا پیغام دیا تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بعد دوسرا پیغام یہ تھا: ان ارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم کہ ہمارے خاندان بنی اسرائیل کو غلامی کے عذاب سے نجات دو اور ہمارے ساتھ بھیجو۔ ہم اپنے وطن فلسطین واپس جانا چاہتے ہیں اور تمہاری غلامی سے نکلنا چاہتے ہیں۔ بالآخر بنی اسرائیل کو اللہ رب العزت نے فرعون کے مظالم اور فرعون کی غلامی سے نجات دلائی۔

فرعون بحیرہ قلزم میں غرق ہوا اور بنی اسرائیل بحیرہ قلزم عبور کر کے وادی تیہ میں داخل ہوئے۔ وادی تیہ اب صحراء سینا کہلاتا ہے، جو کہ اسرائیل اور مصر کے درمیان ہے۔ جس پر تنازعہ چلتا رہتا ہے، نہر سویز کا دوسرا کنارہ۔ وادی تیہ میں بنی اسرائیل نے کیمپ لگا لیے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی، غذا اور بادلوں کے سائے کا بندوبست کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آسمانی کتاب تورات عطا کی، شریعت اور نظام دیا۔ بنی اسرائیل نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہاڑ کو اٹھا کر سائبان کی طرح کر دیا گیا اور انہیں تورات کو قبول کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ پھر سامری نے درمیان میں ایک فتنہ کھڑا کر دیا کہ بچھڑے کو معبود بنا کر پیش کیا۔

درمیان میں ایک لطیفہ کی بات عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہودی عالم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ آپ اپنے پیغمبر کی وفات کے بعد پچیس سال بھی نہیں گزار سکے اور آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ اس نے حضرت علیؓ کو یہ طعنہ دیا تو حضرت علیؓ نے

جواب دیا کہ ہم نے تو حضور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد پچیس سال گزار لیے، تم تو ابھی بحیرہ قلزم سے وادی تیہ میں ٹھکانے پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ راستے میں ہی تم نے ایک بستی میں بت دیکھ کر تقاضہ شروع کر دیا تھا: اجعل لنا الٰھا کما لھم اٰلھۃ۔ اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی معبود مقرر کر دیجئے۔ اور پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے تو تم نے پیچھے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی۔ تم تو پچیس دن بھی نہیں گزار سکے، ہم نے تو پھر بھی پچیس سال گزار لیے۔

قوم عمالقہ سے جہاد:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی اپنی حکمتیں ہوتی ہیں۔ فرعون کا بیڑا تو خود غرق کر دیا، لیکن قوم عمالقہ جو شام اور بیت المقدس پر قابض تھی، اس سے لڑنے کے لیے بنی اسرائیل پر وادی تیہ میں جہاد فرض کر دیا کہ لڑ کر یہ جگہ حاصل کرو۔ فرعون سے تو میں نے تمہیں چھڑا دیا ہے، اب اگلا مرحلہ تم نے خود طے کرنا ہے۔ یہ دنیا اسباب کی جگہ ہے۔ جہاد کرو اور بیت المقدس کو آزاد کرواؤ۔ لیکن بنی اسرائیل نے بیت المقدس کے لیے جہاد کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم نہیں جائیں گے اور کہنے لگے: ان فیھا قوما جبارین وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا۔ وہاں بڑے زبردست قوی لوگوں کا قبضہ ہے، جب تک وہ وہاں سے نکل نہیں جاتے ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ حتیٰ کہ جب اصرار بڑھا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اذھب انت وربك فقاتلا کہ جاؤ، جا کر تم لڑو اور تمہارا رب لڑے، ہم تو نہیں لڑتے ہم تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب آپ جا کر فلسطین کو فتح کر لیں گے تو ہم داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے انہیں فلسطین پر جہاد سے انکار کرنے کی وجہ سے یہ سزا دی۔ قال فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ۔ یتیھون فی الارض کہ چالیس

سال تک ان پر اس زمین کو حرام قرار دیا اور فرمایا تم وادی میں خانہ بدوش رہو گے، صحراء سینا میں گھومتے پھرو گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے وطن کو آزاد کرانے کی حسرت دیکھیے کہ وطن آزاد نہیں ہوا تو جب فوت ہو رہے تھے تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کر کی کہ یا اللہ! میں زندگی میں بیت المقدس نہیں جا سکا، کم از کم میری قبر کو بیت المقدس کے قریب کر دے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ رب العزت نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ان کو بیت المقدس کے اتنے فاصلے پر جا کر دفن کرو جتنی دور سے ایک پتھر پھینکا جا سکتا ہے۔

ان کے بعد اگلی نسل آئی تو حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کا جہاد کیا۔ جہاد کر کے بیت المقدس کو فتح کیا اور بیت المقدس پر ان کی حکومت قائم ہوئی۔ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام پیغمبر بھی تھے، جہاد کے امیر اور سلطنت کے سربراہ بھی تھے۔ فلسطین میں سلسلہ چلتا رہا، انبیاء کرام آتے رہے، وحی اور قوانین لاتے رہے۔ ان کی بنیادی آسمانی کتاب تورات تھی، لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات پر جزوی احکام بھی آتے رہے، ترامیم بھی ہوتی رہیں۔

جالوت سے مقابلہ:

اس کے بعد ایک بار پھر بنی اسرائیل پر یہ مرحلہ آیا کہ ان پر غیر قومیں قابض ہو گئیں۔ ان پر دوسری قوموں کے قابض ہونے اور پھر دوسری آزادی کی جنگ کا بھی قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔ **اذ قالوا لنبی لهم ابعث لنا ملكا نقاتل فی سبيل الله۔** فلسطین کی آزادی کی جنگ کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اس کی قیادت بھی اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر نے کی۔ حضرت سموئیل علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جالوت ہم پر

قابض ہو گیا ہے۔ ہم اس کی غلامی اور اس کے جبر کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ ہم پر کسی کو امیر بنائیں تاکہ ہم اس کی قیادت میں جنگ لڑیں۔ حضرت سموئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں امیر بنا دوں اور تم لڑ نہ سکو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم لڑیں گے۔ **مالنا ان لا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابناءنا** ہم کیوں نہیں لڑیں گے جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔

یہ عہد کروا کر حضرت سموئیل علیہ السلام (بائبل میں شموعیل نام آتا ہے) نے ان پر ایک امیر مقرر کیا جس کا نام طالوت ہے۔ اس پر اعتراضات بھی ہوئے، تحفظات کا اظہار بھی ہوا کہ یہ کیسے امیر بن گیا حالانکہ اس کے پاس تو مال نہیں ہے، فنڈ نہیں ہے تو لڑے گا کیسے؟ خرچے کہاں سے پورے کرے گا؟ تو حضرت سموئیل علیہ السلام نے جواب دیا: **زادہ بسطۃ فی العلم والجسم** کہ وہ جسمانی طور پر بھی ٹھیک ہے اور علم کے لحاظ سے بھی ٹھیک ہے۔ اس میں قیادت کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت طالوتؒ کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جنگ لڑی۔

میدان جنگ نہر اردن کا مغربی اور مشرقی کنارہ تھا، جہاں اسرائیل اور فلسطین کی کشمکش ہے۔ اس کا قرآن مجید نے ذکر کیا: **فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ مبتلکیم بنہر**۔ جب طالوت لشکر لے کر نکلے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نہر کے ذریعے آزمائیں گے۔ اس سے مراد نہر اردن ہے جس کے کنارے پر اسرائیلی بستیاں آباد کرتے ہیں اور فلسطینی احتجاج کرتے ہیں۔ بہر حال وہاں لڑائی ہوئی۔ لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فتح عطا فرمائی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت:

جالوت ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ وہ نوجوان حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا تو اس خوشی میں امیرِ لشکر طالوت نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ کر دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان کے جانشین بنے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا کی اور طالوت نے بادشاہت دے دی۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ خلافت عطا فرمائی، جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے: یاداؤد انا جعلناك خليفة فى الارض ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنا دیا ہے۔ اس کے بعد دو اصول بیان فرمائے: فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله۔ کہ آپ نے حق کے ساتھ حکومت کرنی ہے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہیں کرنی۔ یہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دستور دیا کہ حکومت کیسے کرنی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی ریاست سے باقاعدہ یہودیوں کی ریاست قائم ہوئی ہے۔ آپ علیہ السلام کی حکومت ایک عرصہ تک قائم رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی عظمت اور بڑا مقام عطا فرمایا تھا۔ پھر ان کے بعد ان کی جانشین آپ کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بنے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں درمیان میں ضمناً یہ بات ذکر کر دوں کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تو آپ علیہ السلام پیغمبر بھی ہیں اور بادشاہ بھی ہیں۔ مگر یہودی آپ علیہ السلام کو پیغمبر نہیں مانتے، صرف بادشاہ مانتے ہیں۔ یہ جزوی اختلاف بھی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ان کی سلطنت اس عروج تک پہنچی جس کی آپ علیہ السلام نے دعا کی تھی: رب ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی۔ یا اللہ! مجھے ایسی حکومت دے جیسی میرے بعد کسی کو نہ ملے۔ چنانچہ پھر ایسی حکومت کسی کو نہیں ملی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو انسانوں، جنوں، جانوروں، چرند پرند، ہوا، سمندر الغرض تمام موجود مخلوقات پر حکومت اور سلطنت عطا کی، سب پر کنٹرول عطا کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا نام "اسرائیل" تھا۔ آپ نے اپنے جدِ امجد حضرت یعقوب علیہ السلام کے لقب اسرائیل پر سلطنت کا نام رکھا۔ وہ اسرائیل اپنے زمانے کی دنیا کی عظیم سلطنت تھی۔

یہود کا ہدف عظیم تر اسرائیل:

آج یہودی جو اسرائیل کی بات کرتے ہیں تو ان کا ہدف وہی عظیم تر اسرائیل ہے۔ 1945ء میں اسرائیلی ریاست قائم ہوئی جو اب تک مسلسل چل رہی ہے۔ ان کے ایجنڈے کے مطابق ان کے اہداف میں یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اسرائیلی ریاست جہاں تک تھی ہم نے اسرائیل کی ریاست کو وہاں تک پہنچانا ہے۔ یہودی اس عزم کے ساتھ کوشش کر رہے ہیں۔

گریٹر اسرائیل کے نام سے اس کا نقشہ نیٹ پر موجود ہے۔ اس نقشے میں مصر، عراق، اردن، سوڈان، فلسطین اور شام اور آدھا سعودی عرب شامل ہے۔ گریٹر اسرائیل کی حدود مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے۔ مکہ مکرمہ اس میں شامل نہیں ہے، مدینہ منورہ شامل ہے۔ یہود کا کہنا ہے کہ مدینہ مسلمانوں نے ہم سے چھینا تھا، خیبر سے بھی ہمیں

جبراً نکالا گیا تھا۔ اس لیے خیبر اور مدینہ ہمارا ہے جو کہ اسرائیل کا حصہ ہے۔ وہ ہمارے علاقے ہیں اس لیے ہم وہ علاقے واپس لیں گے۔ ہم نے سلیمان علیہ السلام کے دور کی ریاست دوبارہ بحال کرنی ہے اور وہاں تک جانا ہے جہاں تک حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت عروج پر پہنچ کر پھر زوال کا شکار ہوئی۔ یہودیوں پر زوال کے تین دور گزرے ہیں۔

بخت نصر کا فلسطین پر قبضہ:

بابل جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے عراق میں واقع ہے۔ موجودہ بغداد سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر بابل کے کھنڈرات ہیں۔ بابل بہت بڑی سلطنت اور بہت بڑی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اس پر بڑے بڑے طاقتور حکمران آتے رہے ہیں۔ بابل کو ایک طویل عرصہ نسل در نسل دنیا کے حکمران دارالحکومت کی پوزیشن حاصل رہی ہے۔ ایک زمانے میں بابل کی تہذیب دنیا کی سب سے بڑی تہذیب سمجھی جاتی تھی اور بابل کے حکمران دنیا کے سب سے بڑے حکمران تصور ہوتے تھے۔ اس کو صدیوں تک دنیا میں وہ حیثیت حاصل رہی ہے جو آج واشنگٹن کو حاصل ہے۔ وہاں کا حکمران بخت نصر تھا، جسے بائبل "بنوقد نضر" کہتی ہے۔ اسرائیلی تاریخی روایات کی بناء پر ہماری روایات میں بخت نصر کا ذکر آتا ہے۔

بخت نصر بڑا باجبروت حکمران تھا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کے دور میں بنی اسرائیل پر حملہ کیا، ان کو شکست دی اور بیت المقدس پر قبضہ کر کے بیت المقدس کو تاراج کر دیا، بالکل بلڈوز کر دیا، اکھاڑ کر پھینک دیا۔ جو وہاں یہودی موجود تھے ان کو قتل کر دیا۔ جو زندہ تھے، انہیں گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ بیت المقدس کی پوری بستی یروشلم ایک عرصے تک سوائے کھنڈرات کے کچھ نہیں تھا، ویرانہ کھنڈر بنی رہی۔

حضرت عزیر علیہ السلام (بائبل انہیں عزرایا کے نام سے یاد کرتی ہے) کا جو واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے: **او کالذی مر علی قریة وھی خاویة علی عروشھا**۔ وہ یروشلم شہر کے بارے میں ہی ہے۔ قرآن مجید نے ساری تاریخ بیان کی ہے۔ سارے مراحل بیان کیے ہیں، لیکن ہم اس حوالے سے قرآن مجید پڑھتے نہیں ہیں۔

عراق اور ایران کی کشمکش اس زمانے میں بھی تھی۔ اس وقت ایرانی حکمران سائرس منصف مزاج حکمران تھا۔ اس نے بخت نصر کی تباہی کے بعد ان کی دوبارہ آباد کاری میں مدد کی ہے۔ چنانچہ یہ سب پھر آباد ہوا۔ بنی اسرائیل نے ایرانیوں اور سائرس کی مدد سے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کیا۔ بنی اسرائیل وہاں دوبارہ آباد ہوئے اور پھر بنی اسرائیل پر عروج کا ایک دور آیا۔

یہود کی تاریخ نسلی طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام سے، سلطنت کے طور پر حضرت داؤد علیہ السلام سے اور سسٹم، نظام اور شریعت کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔

یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک یہود کا دور رہا۔ ہم یہود کا جائز دور تورات کے نزول سے حضرت یحییٰ علیہ السلام تک شمار کرتے ہیں۔ اس دور میں یہودی اہل حق تھے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعلان نبوت کیا تو ان کا انکار کر کے یہودی اہل حق کے دائرے سے نکلے۔ یہاں سے یہودیوں میں تفرقہ پیدا ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعلان نبوت کے بعد جنہوں نے ان کو نبی ماننے سے انکار کیا وہ یہودی رہے اور جنہوں نے ان کو نبی مان لیا وہ عیسائی کہلائے۔ ایک گروہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مان لیا اور ایک گروہ نے

انکار کر دیا۔ انکار کرنے والوں کی اکثریت تھی۔ کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے جو حواریین کہلاتے ہیں۔

روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ بنی اسرائیل کے پہلے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں جو خود اسرائیل تھے اور بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ بنی اسرائیل میں تین آسمانی کتابیں آئی ہیں: تورات، زبور اور انجیل۔ بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کی تعداد تین ہزار اور بعض روایات میں چار ہزار آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کا گلشن آباد کر دیا تھا، نبیوں کی بہار لگا دی تھی کہ باپ بھی نبی، بیٹا بھی نبی، بھائی بھی نبی، چچا بھی نبی۔

حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کا دور تھا، تو وہ بنی اسرائیل کے امام تھے اور بیت المقدس کی مجاورت اور سیادت و قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، ان کو نبوت ملی تو یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا بلکہ نعوذ باللہ ایک حلال زادہ انسان ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

یہودیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک لمبی تاریخ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہودیوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے انہیں قتل کر دیا تھا، سولی پر چڑھا دیا تھا۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ سولی پر چڑھ گئے تھے، تین دن قبر میں رہے، پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمانوں پر اٹھائے گئے۔ جب کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے: **وما قتلوہ وما صلبوہ** کہ نہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر سکے اور نہ سولی چڑھا سکے، **بل رفعہ اللہ الیہ** بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ آپ علیہ السلام نہ سولی

چڑھے، نہ قتل ہوئے، نہ موت آئی، نہ قبر میں گئے، ویسے ہی زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے، جہاں زندہ سلامت موجود ہیں اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے۔

طیطس رومی کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی:

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لیے گئے تو پھر آپ کے حواریوں کے ذریعے عیسائی مذہب پھیلا۔ روم کے حکمران عیسائی ہوئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے پون صدی بعد رومی حکمران طیطس رومی نے ایک دفعہ پھر یہودیوں پر، یروشلم اور بیت المقدس پر حملہ کیا اور ایک دفعہ پھر بیت المقدس اجڑ گیا۔ اس نے بھی یہی کیا کہ سب یہودیوں کو قتل کر دیا، بیت المقدس کو بلڈوز کر دیا، جڑوں سے اکھاڑ دیا اور چٹیل میدان کر دیا۔ جو یہودی بچ گئے ان کو وہاں سے نکال دیا اور ان کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ چنانچہ یہودی دنیا میں تتر بتر ہو گئے اور بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں آگیا۔ طیطس رومی کے حملے کے بعد سے 1945ء تک یہودیوں کو دنیا میں کہیں بھی ریاست نصیب نہیں ہوئی۔ اس دوران ان کی کیفیت یہ رہی کہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے، کہیں ان کی اجتماعیت نہیں تھی۔ بعض جگہوں پر یہودی طاقتور تھے، لیکن ان کا اقتدار اور ریاست نہیں تھی۔

638ء میں بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ:

اس کے بعد بیت المقدس حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی تحویل میں آیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فلسطین فتح ہوا تھا۔ فاتحِ فلسطین حضرت ابو عبیدہ عمرو بن الجراحؓ ہیں۔ مسلمانوں نے عیسائیوں سے بیت المقدس کا قبضہ لیا ہے۔ عیسائیوں نے ہی صلیبی جنگوں میں ہمیں شکست دے کر بیت المقدس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ جس کے بعد تقریباً ایک

صدی تک عیسائیوں کا قبضہ رہا۔ پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے مسلسل جنگوں کے ذریعے بیت المقدس کو دوبارہ عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کروایا۔

بیت المقدس سے متعلق مسلمانوں کی اگلی کشمکش یہودیوں کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ عیسائیوں کے ساتھ چلتی رہی ہے۔ اب کی بار بیت المقدس پر یہودیوں نے قبضہ کیا ہے۔ 1967ء میں اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کیا اور بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا ہے۔ یہ میری ہوش کا زمانہ ہے۔ اس وقت جلوس نکالنے والوں اور نعرے لگانے والوں میں ہم بھی تھے۔

مسلم یہودی تعلقات:

مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کا معاملہ کیسا رہا؟ یہ بھی نظر میں رہنا چاہیے۔ جب جناب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا یہودیوں کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں تھا۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں یہودیوں سے واسطہ پیش آیا۔ یہودیوں کے تین بڑے قبیلے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ وہاں آباد تھے۔

یہود کی یثرب میں آبادکاری:

تاریخی روایات کے مطابق یہودی جب بکھرے ہوئے تھے تو انہوں نے اپنی کتابوں میں جو نبی آخر الزمان کی نشانیاں پڑھ رکھی تھیں، ان نشانیوں کی بنیاد پر وہ اس علاقے کو پہچان کر یمن اور دیگر علاقوں سے آکر یثرب میں آباد ہو گئے تھے۔ یہودی اس انتظار میں تھے کہ جب نبی آخر الزمان آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ ملیں گے اور ہمیں دوبارہ قوت حاصل ہو گی۔ قرآن مجید میں ہے: **ولقد کانوا من قبل یستفتحون علی الذین**

کفروا یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ یہودی کئی نسلوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا نام لے کر فتح کی دعا مانگا کرتے تھے اور دوسری قوموں پر رعب جمایا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل ہم دنیا پر رعب جماتے ہیں کہ حضرت مہدیؑ آنے والے ہیں وہ تم سے نمٹیں گے۔ ہم خود کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، حضرت مہدیؑ کا نام لیتے ہیں کہ ان کا زمانہ آئے گا تو ہم تمہیں دیکھیں گے۔ یہی بات یہودی کیا کرتے تھے کہ ہمارے آخر الزمان پیغمبر آئیں گے تو ہم ان کی قیادت میں آگے چلیں گے اور ہمارا اقتدار دوبارہ بحال ہو گا۔

حضور نبی کریم ﷺ سے یہود ونصاریٰ کا حسد:

لیکن یہودیوں کی توقع کے بہت خلاف بات یہ ہوئی جس کی وجہ سے انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو نہیں مانا، حالانکہ وہ آپ ﷺ انتظار میں تھے، آپ کو پہچان بھی لیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے: **الذین آتیناھم الکتاب یعرفونه کما یعرفون ابناءھم**۔ جیسے باپ کو اپنی اولاد کے پہچاننے میں غلطی نہیں لگتی، اہل کتاب کو بھی حضور نبی کریم ﷺ کو پہچاننے میں غلطی نہیں لگی۔ وہ پہچان گئے تھے کہ آپ ﷺ ہی نبی آخر الزمان ہیں، لیکن ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل میں آئیں گے، مگر وہ چچازاد بھائیوں میں آگئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں آگئے۔ یہ ان کے انکار کرنے کی بنیاد بنی کہ وہ بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں آگئے۔

یہ امر واقع ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے جناب نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود محض حسد کی وجہ سے انکار کر دیا۔ قرآن مجید میں ہے: **حسدا من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم الحق**۔ حق واضح ہو جانے کے بعد حسد کی وجہ سے انکار کر دیا۔ میں

اس پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دوں گا کہ عیسائیوں کے حضور نبی کریم ﷺ کے انکار کی وجہ بھی یہی تھی۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ جب قیصر روم اور حضرت ابو سفیان کا مکالمہ ہوا، سوالات جوابات ہوئے اور قیصر نے تبصرے کیے تو آخر میں قیصر نے یہ جملہ کہا کہ جو باتیں تم نے بتائی ہیں اگر وہ صحیح ہیں انہ لنبی تو پھر وہ نبی ہی ہے۔ اس نے کہا میں بھی اس پیغمبر کے انتظار میں تھا اور یہ بھی کہا کہ مجھے اس پر خواب بھی آرہے تھے، اشارات بھی ہو رہے تھے۔ اگر میرا بس چلے، موقع بنے تو میں اس پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اگر میں پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے پاؤں کو اپنے ہاتھوں سے دھونا سعادت سمجھتا ہوں۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اس نے انکار کیوں کیا؟ اسی روایت میں مذکور ہے کہ اس نے کہا مجھے یہ تو یقین اور انتظار تھا کہ وہ پیغمبر آخر الزمان آنے والا ہے، لیکن مجھے یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آجائے گا۔ یہاں سے کانٹا بدل گیا کہ وہ نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں آئے گا یہ مجھے توقع نہیں تھی۔ یہی بات یہودیوں کے انکار کی بھی وجہ بنی۔

یہود کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے حکمت عملی:

جب حضور نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت عملی سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مانوس کرنے کے لیے یا ان کو کسی بات کا موقع نہ دینے کے لیے ابتدائی سترہ مہینے مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کو قرار دیا تاکہ ہم آہنگی رہے اور یہودی اس ماحول میں کوئی بات سمجھیں۔ یہودیوں کو مانوس کرنے کے لیے سترہ مہینے ہمارا قبلہ بیت المقدس رہا جو یہودیوں کا بھی قبلہ تھا۔

حکمت عملی اور باہمی ہم آہنگی کا ایک دائرہ اور بھی تھا۔ یہودیوں کو مانوس کرنے کے لیے اور اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی گئی۔ اس پر بخاری شریف کی روایت ہے ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں جب یہودیوں سے پوچھا کہ تم عاشورہ کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے ہمیں فرعون کی غلامی سے آزادی دی تھی، فرعون کو غرق کیا تھا اور ہمیں نجات دی تھی۔ ہم اس خوشی میں روزہ رکھتے ہیں، یہ ہمارا یومِ آزادی کا روزہ ہے تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **نحن احق بموسی منکم** کہ حضرت موسیٰ پر ہمارا حق تم سے زیادہ ہے۔ اس لیے ہم بھی یہ روزہ رکھیں گے۔ لیکن یہ ساری حکمتیں اختیار کرنے کے باوجود یہودی اپنے انکار پر اڑے رہے۔

جناب نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ میثاق مدینہ کے ذریعے جو ایک باقاعدہ مکمل دستور ہے آپس میں مشترکہ ریاست کا عمل بھی شروع کیا۔ میثاق مدینہ ایک مشترک ریاست ہے جس میں تمام مذاہب کے لوگ شریک تھے۔

تاریخ کا ایک دلچسپ سوال:

ایک دلچسپ بات کرنا چاہ رہا ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تیرہ سال ایسی زندگی گزاری کہ مظلومیت کی انتہا تھی، وہاں تین سال محاصرہ گزار کر اور عام الحزن منا کر مدینہ منورہ آئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ اور جناب ابو طالب کی وفات کے سال کو غم کا سال قرار دیا تھا۔ اس کیفیت میں مکہ مکرمہ سے نکل کر جب مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں آتے ہی چند دنوں میں حضور نبی کریم ﷺ کی حکومت بن گئی اور ریاست قائم ہو گئی۔ تاریخ کا سوال ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ آپ مہاجر اور پناہ گزین بن کر آئے لیکن آتے ہی

حکومت سنبھال لی؟ چند دنوں میں میثاق مدینہ بھی ہو گیا اور حضور نبی کریم ﷺ حکمران بھی تسلیم کر لیے گئے۔ یہودیوں نے بھی انہیں تسلیم کر لیا، دیگر قبائل نے بھی تسلیم کر لیا اور ایک ریاست وجود میں آگئی جو جزیرۃ العرب میں پہلی ریاست تھی۔

جناب نبی کریم ﷺ کے سیاسی کارناموں میں تاریخ اس کو سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی ہے کہ پورے جزیرۃ العرب میں قبائلی سسٹم تھا، کوئی مرکزیت اور مرکزی وفاقی حکومت نہیں تھی۔ حجاز، نجد اور جزیرۃ العرب کے پورے علاقے میں پہلی باضابطہ حکومت میثاق مدینہ کے نتیجے میں مدینہ منورہ میں قائم ہوئی، جس کے حکمران حضور نبی کریم ﷺ تھے۔ جب حضور نبی کریم ﷺ کے سیاسی کردار کی بات ہوتی ہے تو یہ سب سے بڑی بات سمجھی جاتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قبائلی سسٹم کو ایک مرکزی حکومت عطا کی اور میثاق مدینہ کے نتیجے میں بننے والی حکومت جو ایک علاقے تک محدود تھی، بڑھتے بڑھتے ایک وقت آیا کہ افریقہ، ایشیا اور یورپ کے براعظم اس کے دائرے میں تھے۔

مدینہ منورہ پہنچتے ہی اسلامی ریاست کا قیام کیونکر ممکن ہوا؟

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو کیا حالات فراہم کر دیے تھے کہ مدینہ منورہ آتے ہی چند دنوں میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی؟ اس پر میں بخاری شریف کی ایک روایت ذکر کرنا چاہوں گا جس سے یہ بات سمجھ آئے گی۔

مدینہ منورہ میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی بنو خزرج کا سردار تھا۔ بڑے سردار تو سعد بن عبادہؓ تھے لیکن یہ بھی سرداروں میں تھا۔ اس نے ابھی کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ کی بیمار پرسی کے لیے جا رہے تھے تو راستے میں ایک مجلس میں عبد اللہ بن ابی سے جھڑپ ہو گئی۔

مجلس میں حضور نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر قرآن مجید سنایا تو وہ ناک بھوؤں چڑھا کر کہنے لگا کہ ہمارے پاس آ کر مت پڑھا کرو، جس کو سنانا ہو اپنے گھر بلا کر سنایا کرو۔ جس پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: ہم کیوں نہیں سنائیں گے؟ سنائیں گے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور عبداللہ بن ابی کا جھگڑا ہوا۔ لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب حضور نبی کریم ﷺ حضرت سعد بن عبادہؓ کے پاس پہنچے تو ان سے شکایت کی کہ ابو حباب عبداللہ بن ابی نے یہ حرکت کی ہے۔

جو بات میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو علم تو ہے کہ عبداللہ بن ابی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ وہ اپنا غصہ نکال رہا ہے، لہٰذا اسے چھوڑیں، نظر انداز کریں، اس کو اپنا غصہ نکالنے دیں۔ اس کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ اس علاقے کے قبائل نے آپس میں مل کر ایک حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے آپس میں مذاکرات وغیرہ ہو چکے تھے، سارے مراحل گزر گئے تھے۔ یثرب اور اس کے ارد گرد کی پوری ساحلی پٹی نے مشترکہ حکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور عبداللہ بن ابی کو بادشاہ چن لیا تھا۔ صرف آخری مرحلہ باقی تھا جس میں ایک اکٹھ کر کے جشن منانا تھا اور اس کی تاج پوشی کرنی تھی، باقی سارے کام ہو چکے تھے کہ اتنے میں آپ تشریف لے آئے تو وہ جتنا کام ہوا تھا، آپ نے سنبھال لیا۔ زمین ہموار تھی، سب معاملات طے پا چکے تھے۔ آپ تشریف لے آئے تو سارے معاملات کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی اس پر عبداللہ بن ابی پیچ و تاب کھا رہا ہے اور اس بات کا غصہ نکال رہا ہے۔ لہٰذا اسے غصہ نکالنے دیں، اور آپ نظر انداز کر دیں۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے نظر انداز کر دیا اور وہ آخر تک پیچ و تاب ہی کھاتا رہا۔

یہودی قبائل کی مدینہ منورہ سے جلاوطنی:

حضور نبی کریم ﷺ کے مدینہ منورہ آنے سے پہلے یہ حکومت بنی تو تینوں یہودی قبیلے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ اس ریاست کا فرد تھے اور میثاق مدینہ کے نتیجے میں بننے والی حکومت کا بھی حصہ تھے، لیکن اپنی سرشت کے باعث کہ حسد اور سازش یہودیوں کی سرشت میں شامل ہے اور معاہدے کی خلاف ورزیاں کرتے کرتے ایک ایک کرکے مدینہ منورہ سے جلاوطن ہوئے۔ یہودی مرحلہ وار میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے رہے اور قبائل کی روایت کے مطابق جو جرگوں کے فیصلے ہوتے تھے اس کے مطابق جلاوطن ہوتے رہے۔

غزوہ بدر کے بعد پہلے مرحلے میں بنو قینقاع جلاوطن ہوئے۔ بنو قینقاع کا ایک واقعہ ہوا تھا۔ ایک بچے کا سر کچلا گیا تھا۔ اس پر ایکشن ہوا، جرگہ بیٹھا اور جرگے نے فیصلہ کیا، لہٰذا بنو قینقاع کو معاہدے کی خلاف ورزی پر جلاوطن کیا گیا۔ غزوہ احد کے بعد بنو نضیر کا محاصرہ کیا گیا، وہ بھی عہد شکنی کی وجہ سے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش کی تھی جس میں ناکام ہوئے۔ غزوہ احزاب کے بعد بنو قریظہ کو جلاوطن کیا گیا کہ وہ احزاب کی جنگ میں حملہ آوروں کے ساتھ تھے۔ ان کی خفیہ سازباز تھی جو ثابت ہو گئی تو ان کو بھی عہد شکنی کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی عظیم سیاسی حکمت عملی:

اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت، جناب نبی کریم ﷺ کی حکمت عملی اور یہودیوں کی کوتاہ اندیشی تھی کہ یہود نے میثاق مدینہ سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو مستحکم کرنے کی بجائے اس کی خلاف ورزی کر کے اپنے راستے خود مسدود کر دیے اور پانچ سال کے عرصے میں پورا

مدینہ منورہ یہودیوں سے خالی ہو گیا۔ بنو قریظہ کی جلاوطنی کے بعد اکا دکا کوئی یہودی مدینہ منورہ میں رہ گیا ہو گا، بطور قبیلے کے تمام قبائل جلاوطن ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ کی ریاست کو سب سے زیادہ خطرہ انہی سے تھا، لیکن غزوہ احزاب کے خاتمے تک یہ تینوں قبیلے صاف ہو گئے تھے۔

یہ جناب نبی کریم ﷺ کی سیاسی حکمت عملی تھی۔ حضور نبی کریم ﷺ بہت عظیم سیاست دان تھے۔ ہم دوسری باتوں کے متعلق تو پوچھتے ہیں، مگر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے سیاست کیسے کی تھی، اپنی معاصر قوتوں سے کیسے نمٹے تھے؟ کیا حکمت عملی اختیار کی؟ آج بھی دنیا حیران پریشان ہے کہ انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا کہ پانچ سال کے عرصے میں سارے یہودیوں کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔ جلاوطن ہونے کے بعد یہودی خیبر میں اکٹھے ہوتے گئے اور خیبر کو اپنا مرکز بنا لیا۔ خیبر میں یہودیوں کی آبادی خاصی تھی۔ وہاں انہوں نے قوت جمع کی۔ خیبر میں ان کے سب سے بڑے سردار حیی بن اخطب حضور نبی کریم ﷺ کے خسر بزرگوار تھے۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ ان کی بیٹی ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ کی جنگی حکمت عملی:

اس کے بعد جناب نبی کریم ﷺ کو خبریں ملنے لگیں کہ یہودی خیبر میں ہمارے خلاف تیاریاں کر رہے ہیں تو جناب نبی کریم ﷺ نے یہودیوں سے نمٹنے کے لیے پہلے اپنے خاندان قریش سے صلح کی جو کہ صلح حدیبیہ کے نام سے معروف ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے کمزور شرطوں پر صلح کر لی۔ صلح حدیبیہ کی شرطیں دیکھ کر حضرت عمرؓ کو بار بار غصہ آتا تھا کہ یارسول اللہ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ مگر حضور نبی کریم ﷺ کے

سامنے یہ تھا کہ یہودیوں سے نمٹنے کے لیے مشرکینِ مکہ سے صلح ضروری ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی حکمت عملی پر غور کریں کہ جب تک قریشیوں سے جنگ تھی یہود سے معاہدہ تھا اور جو نہی قریشیوں سے صلح ہوئی ہے تو حدیبیہ سے واپسی پر سیدھے خیبر پر حملہ کر دیا۔

غزوۂ خیبر:

تصور کیجیے کہ بظاہر کتنی کمزور شرطوں پر صلح کی ہے لیکن جو نہی معاہدہ ہوا، حدیبیہ سے آتے ہی حضور نبی کریم ﷺ نے ایک مہینہ بھی انتظار نہیں کیا اور خیبر پر چڑھائی کر دی اور ایسے چڑھائی کی کہ خیبر والوں کو پتا ہی نہیں چلنے دیا جب تک خیبر میں پہنچ نہیں گئے۔ خیبر کے یہودی صبح اپنے کاموں پر جا رہے تھے کہ اچانک حضور نبی کریم ﷺ کے لشکر پر نظر پڑی تو چونکے: **محمد والخمیس**۔ محمد آ گئے، لشکر آ گیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی راز داری کا یہ عالم تھا کہ مدینہ منورہ سے لشکر لے کر چلے، خیبر پہنچے۔ جب تک خیبر کی گلیوں میں داخل نہیں ہوئے خیبر والوں کو کچھ پتا نہیں چلنے دیا کہ میں آ گیا ہوں۔ چنانچہ خیبر میں جنگ ہوئی اور یہودیوں کو شکست ہوئی۔ جناب نبی کریم ﷺ نے یہودیوں پر حملہ کرنے سے پہلے قریشیوں سے معاہدہ کرنا ضروری سمجھا اور قریش سے جنگ کرنے سے پہلے یہودیوں سے معاہدے کیے۔ نبی کریم ﷺ نے دو محاذ بیک وقت نہیں کھولے، یہ آپ کی حکمت عملی کی انتہا تھی۔

حضور نبی کریم ﷺ نے یہودِ خیبر کو پھر بھی ایک موقع دیا اور خیبر کی زمینیں بطور مضارع کے ان کے حوالے کر دیں۔ پھر یہودی خیبر میں ہی رہے۔ لیکن جاتے جاتے نبی کریم ﷺ وصیت کر گئے تھے: **اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب** کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی آخری وصیتوں میں سے

ہے۔ اس وصیت پر حضرت عمرؓ نے عمل کیا اور اپنے دور خلافت میں یہودیوں کو خیبر سے جلا وطن کر دیا۔

اس سارے واقعہ میں چودہ پندرہ سال لگے ہیں۔ دس سالہ مدنی دور عہد نبوی، اڑھائی سالہ عہد صدیقی اور اس کے سال، ڈیڑھ سال بعد یعنی پندرہ سال کے اندر اندر یہودی پورے جزیرۃ العرب سے بے دخل ہو چکے تھے۔ مدینہ منورہ سے بھی اور خیبر سے بھی نکل چکے تھے اور کہیں تھے ہی نہیں۔ اسی لیے یہودی کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ اور خیبر سے زبردستی نکالا تھا، لہٰذا خیبر بھی ہمارا ہے اور مدینہ بھی ہمارا ہے، ہم دوبارہ واپس جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس ارادے میں ناکام ونامراد فرمائیں۔

یہود آج سے ایک صدی پہلے تک:

خیبر کی جلاوطنی سے لے کر آج سے ایک صدی پہلے تک دنیا میں کہیں بھی ہماری یہودیوں کے ساتھ کوئی کشمکش، جھگڑا اور کوئی جنگ نہیں ہے۔ ان سے آخری معاملہ حضرت عمرؓ کے ان کو خیبر سے جلا وطن کرنے کا تھا۔ اس کے بعد جنگ عظیم اول کے دور تک یہودیوں کے ساتھ دنیا میں ہمارا کہیں بھی کوئی تنازعہ نہیں رہا۔ اس دوران تقریباً بارہ تیرہ سو سال بنتے ہیں۔ یہ بارہ تیرہ سو سال کیفیت یہ تھی کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں کشمکش تھی۔ عیسائی یہودیوں پر ظلم ڈھاتے تھے، ان کی مسلسل پٹائی کرتے رہے اور مسلمان یہودیوں کی پناہ گاہ تھے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک ہم یہودیوں کی سب سے محفوظ پناہ گاہ رہے ہیں۔ عیسائیوں نے اٹلی، فرانس اور برطانیہ میں یہودیوں کو بہت مارا ہے۔ انہیں آگ میں جلا دیتے تھے اور قتل کر دیتے تھے۔ پون صدی قبل ان کا آخری راؤنڈ ہٹلر والا ہے، جسے ہولو کاسٹ کہتے ہیں۔ ہٹلر آخری عیسائی تھا جس نے یہودیوں کو بہت مارا۔ وہ تو کہتا تھا کہ دنیا میں

اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک ایک یہودی بھی زندہ ہے۔ اس کی یہ بات ٹھیک تھی۔

یہ الگ داستان ہے، لیکن میں یہ ذکر کر رہا ہوں کہ یہ امر واقع ہے، یہودی مؤرخ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہر طبقے میں ہر مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، منصف مزاج بھی ہوتے ہیں۔ آج کا منصف مزاج یہودی مؤرخ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہودیوں کی بارہ سو سال سے زیادہ عرصے تک عیسائیوں کے ساتھ لڑائی تھی اور دنیا میں ہمیں اندلس کی مسلمان حکومت اور ترکی کی خلافت عثمانیہ سے اچھی پناہ گاہ کہیں نہیں ملی۔ اندلس کی مسلمان حکومت اور خلافت عثمانیہ یہودیوں کو پناہ دیتے تھے، پروٹوکول اور اعزاز دیتے تھے، انہیں پیسے دیتے تھے اور ان پر خرچ کرتے تھے۔ تقریباً بارہ سو سال یہ کیفیت رہی ہے کہ یہودی دنیا بھر میں افراتفری کا شکار تھے۔ کہیں بھی یہودیوں کی ریاست نہیں تھی۔

تحریکِ صہیونیت:

یہودیوں کے ذہن میں ابتدا میں ہی یہ تصور تھا جو نسل در نسل انہیں منتقل ہوتا چلا آیا ہے کہ فلسطین ہمارا قومی وطن ہے اور ہم نے وہ وطن واپس لینا ہے۔ یہ سبق انہیں نسل در نسل پڑھایا جاتا رہا اور وہ یہ سمجھتے تھے اب بھی سمجھتے ہیں کہ فلسطین سے ہمیں زبردستی نکالا گیا تھا۔ وہ ہمارا حق ہے۔ یہ بات یہودیوں کے ذہنوں میں پرورش پاتی رہی حتیٰ کہ 1897ء میں یورپی ملک سویٹزر لینڈ کے شہر باسل میں یہودیوں کی عالمی کانگرس ہوئی ان کے دنیا بھر کے نمائندے آئے۔ وہاں انہوں نے صہیونیت کے نام سے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔

صہیون فلسطین میں ایک پہاڑی کا نام ہے جو کہ بیت المقدس کے ساتھ ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں ثور، حرا اور صفا، مروہ کی پہاڑیاں مقدس ہیں، اسی طرح ان کے ہاں

صہیون کی پہاڑی بہت مقدس ہے اور اسے یہودیوں کے ہاں وہی درجہ حاصل ہے جو ہمارے ہاں صفا، مروہ اور حرا کی پہاڑیوں کو حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑی پر حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ تھی۔ آپ علیہ السلام کئی کئی مہینے وہاں خلوت میں جایا کرتے اور عبادت کیا کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام کی اس نسبت سے صہیون پہاڑی کے نام پر انہوں نے صہیونزم کی تحریک منظم کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ہم نے اپنا قومی وطن واپس لینا ہے۔

یہودیت نسلی مذہب:

یہ بھی واضح رہے کہ یہودیت خالص نسلی مذہب ہے۔ دنیا میں مذاہب کے اپنے اپنے مزاج ہیں۔ یہودیت بنی اسرائیل کا مذہب ہے۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا مذہب نسلی ہے۔ اسی لیے یہودی کسی غیر قوم کو یہودی ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔ کوئی اور اگر یہودی ہو جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں، لیکن اسرائیلی نسل سے ہٹ کر کسی کو یہودی ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔ اور ان کے عقیدے میں تفاخر شامل ہے کہ دنیا میں حکمرانی صرف بنی اسرائیل اور یہودیوں کا حق ہے۔ باقی ساری قومیں ہماری محکومیت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ نسلی تفاخر پر ہی ان کے مذہب کی بنیاد ہے اور نسلی تفاخر پر ہی ان کی ریاست اور قومیت کی بنیاد ہے۔

مسئلہ فلسطین کا پس منظر:

اس زعم کے ساتھ جب یہودیوں نے 1897ء میں فلسطین پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا تو صورتحال یہ تھی کہ فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ خلافت عثمانیہ کا مرکز استنبول تھا جو اس وقت قسطنطنیہ کہلاتا تھا۔ خلافت عثمانیہ میں مشرقی یورپ، ایشیا کے اکثر علاقے، عرب تقریباً سارا، افریقہ کے کچھ ممالک الجزائر، تیونس وغیرہ تھے۔ خلافت عثمانیہ تین

براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایک زمانہ گزرا جب خلافت عثمانیہ نے دنیا کی سپر پاور کے طور پر تین سو سال حکمرانی کی ہے۔ اس کا مجموعی زمانہ تقریباً چار، ساڑھے چار سو سال بنتا ہے۔ اس وقت عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی امیر المومنین تھے جو کہ بڑے سمجھدار، ذہین اور حوصلہ مند خلیفہ تھے۔ عبدالحمید ثانی 1876ء سے 1909ء تک خلیفہ رہے ہیں۔

یہ ان کی خلافت کا زمانہ تھا۔ یہودیوں نے ان سے سودے بازی کی کوشش کی۔ یہودیوں کا لیڈر تھیوڈرل ہرتزل منتخب ہوا۔ یہودی کانگرس نے اسے اپنا چیئرمین منتخب کیا اور اس کے ذمے لگایا کہ تم فلسطین کی بحیثیت یہودی قومی وطن کے واپسی کے راستے ہموار کرو۔ عالمی کانگرس میں یہ فیصلہ ہوا کہ ہم فلسطین یہودی قومی وطن کے طور پر واپس لیں گے اور وہاں اسرائیل ریاست قائم کریں گے۔ سلطان عبدالحمید ثانی جو بعد میں معزول کر دیے گئے تھے۔ جلاوطنی میں زندگی گزاری ہے۔ یہ ایک الگ تاریخ ہے۔ سلطان کی یادداشتیں چھپ چکی ہیں۔ اصل میں ترکش میں تھیں اب عربی ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے اپنی یادداشتوں میں اس کی تفصیلات لکھی ہیں۔ میں اس کا کچھ خلاصہ ذکر کر دیتا ہوں۔

فلسطین میں آبادکاری کے لیے خلافت عثمانیہ سے درخواست:

سلطان عبدالحمید ثانی کہتے ہیں کہ ہرتزل جو یہودیوں کا عالمی لیڈر تھا باب عالی میں مجھ سے ملنے آیا۔ باب عالی خلافت کا مرکز تھا۔ جس طرح آج کل امریکہ کا مرکز علامتی طور پر وائٹ ہاؤس ہے۔ بابِ عالی کو دنیا میں وہی پوزیشن حاصل تھی جو اس وقت وائٹ ہاؤس کو حاصل ہے۔ ہرتزل باب عالی میں آیا اور پیشکش کی کہ خلافت عثمانیہ پر جتنے قرضے ہیں وہ میں ادا کر دوں گا۔ آپ ایسا کریں کہ فلسطین میں ہم یہودیوں کو زمین خریدنے اور وہاں آباد ہونے کی سہولت اور اجازت فراہم کریں۔ کیونکہ خلافت عثمانیہ کے دور میں قانون یہ تھا کہ

یہودی فلسطین آسکتے ہیں، اپنے مقدس مقامات کی زیارت کر سکتے ہیں، کچھ دن رہ سکتے ہیں، لیکن مستقل آباد نہیں ہو سکتے، زمین خرید نہیں سکتے اور کاروبار نہیں کر سکتے۔ اس کی اجازت انہیں قانوناً نہیں تھی۔

اس کی وجہ کیا تھی؟ سلطان عبدالحمید مرحوم لکھتے ہیں کہ ہم سمجھتے تھے کہ یہودی مالدار قوم ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر بڑی رسوا قوم تھی، بکھرے ہوئے تھے لیکن مال ان کے پاس تھا۔ تو یہ آکر زمینیں خریدیں گے، آباد ہوں گے اور پھر آہستہ آہستہ فلسطین پر قبضہ کر لیں گے۔ ہمیں یہودیوں کے عزائم کا علم تھا تو اس بنیاد پر خلافت عثمانیہ نے پابندی لگا رکھی تھی کہ یہودی یہاں زمین نہیں خرید سکتے، نہ یہاں آباد ہو سکتے ہیں اور نہ کاروبار کر سکتے ہیں۔ ہاں اپنے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے آسکتے ہیں۔ ہرتزل نے سلطان عبدالحمید سے درخواست کی کہ ہم یہودیوں کو یہاں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ فلسطین کے علاقے میں ہمیں زمین خریدنے اور آباد ہونے کی اجازت دی جائے اور یہ پیشکش کی کہ خلافت عثمانیہ مقروض ہیں۔ ہم اس کے سارے قرضے ادا کر دیں گے۔ عبدالحمید ثانی نے انکار کر دیا کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ چنانچہ وہ ناکام واپس چلا گیا۔

پھر دوبارہ ایک یا دو سال بعد ہرتزل خلیفہ عبدالحمید کے پاس آیا اور پیشکش کی کہ ہم تمہارے قرضے بھی ادا کر دیں گے اور وہ دور سائنس کی ترقی کا دور تھا، سائنسدان تقریباً اکثر یہودی تھے۔ اس نے کہا میں سارے سائنسدان آپ کو فراہم کر دوں گا یعنی پیسہ بھی دوں گا اور سائنسی ترقی میں آپ کی امداد بھی کروں گا اور ایک بلینک چیک دستخط کر کے سلطان عبدالحمید کے سامنے رکھ دیا کہ جتنے پیسے آپ کو ضرورت ہوں اس پر لکھیں، ہم اس کے ذمہ دار ہیں، لیکن آپ ہماری یہ درخواست قبول کریں۔

سلطان کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت ذرا غصے کا اظہار بھی کیا۔ میں نے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ میرے پاس اس کام کے لیے نہ آنا۔ میں یہ بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں کہ فلسطین میں یہودیوں کو جگہ خریدنے کی اجازت دوں۔ میں اس کا روادار نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے عزائم کا علم ہے۔ تم بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہ رہے ہو اور اس کے لیے تمہاری یہ چال ہے۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا اور آئندہ اس مقصد کے لیے تمہیں میرے پاس آنے کی اجازت نہیں ہے۔ سلطان کہتے ہیں میں نے اپنے عملے کو بھی ہدایت کر دی کہ آئندہ اس شخص کو ملاقات کا وقت نہ دیا جائے۔

جب عبد الحمید نے ہرتزل کو ڈانٹا، اس کی درخواست مسترد کر دی تو اس کے بعد یہودیوں نے مایوس ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یہ تو ہماری بات سننے کو تیار نہیں ہے لہٰذا اب ہم کسی اور سے رابطہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی دشمن قوتیں جو ان کی بھی دشمن تھیں۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی اور روس وغیرہ یہودی دشمن ممالک تھے، یہودیوں کو ان کے ہاں کوئی رسائی حاصل نہیں تھی، لیکن انہوں نے یہ طے کیا کہ اب ہم ان کے ساتھ رابطہ کریں گے۔

سلطان عبد الحمید لکھتے ہیں کہ میرے خلاف ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے، تحریک شروع ہو گئی کہ یہ ظالم ہے۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے کونسل بنی، نوجوان منظم ہو گئے، سلطان کے خلاف تحریک منظم ہوئی۔ سلطان ان ہنگاموں کا سامنا نہیں کر سکے اور انہیں معزول کر دیا گیا۔ سلطان عبد الحمید لکھتے ہیں کہ مجھے تب اندازہ ہوا کہ میرے پیچھے سازشوں کا مرکز کیا ہے جب ملک کی دستور ساز اور قانون ساز کونسل کی طرف سے میری معزولی کا پروانہ لے کر میرے پاس جو شخص آیا تھا وہ یہودی تھا، "قرہ صو" ترک پارلیمنٹ کا ممبر اور صہیونی تحریک کا فرد تھا، جسے خلافت عثمانیہ نے پناہ دی تھی۔ پارلیمنٹ کے اس یہودی

ممبر نے وہ پروانہ میرے ہاتھ میں دیا کہ اب آپ خلیفہ نہیں رہے۔ عبدالحمید بڑا مضبوط خلیفہ تھا، اگر وہ معزول نہ ہوتا تو اس نے یہ صورتحال پیدا نہیں ہونے دینی تھی، لیکن وہ معزول ہو گیا اور نیا خلیفہ آ گیا تو اس کے بعد یہودیوں نے یورپین ملکوں سے رابطہ قائم کیا۔

یہود اور برطانیہ کے درمیان بالفور معاہدہ:

آپ نے اعلان بالفور کی اصطلاح سنی ہو گی۔ بالفور برطانیہ کے وزیر خارجہ کا نام تھا۔ اس کا پورا نام آرتھر جیمز بالفور تھا۔ یہودیوں نے برطانیہ کے ساتھ ساز باز شروع کی۔ وہ جنگ عظیم اول کا دور تھا۔ جنگ عظیم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہودیوں نے برطانیہ کو پیشکش کی کہ آپ کی جنگ عظیم کے تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے اور اپنی سائنس، ترقی اور ٹیکنالوجی سب آپ کے حوالے کر دیں گے۔ آپ ہمارا حق تسلیم کریں اور اعلان کریں کہ فلسطین یہودیوں کا قومی وطن ہے اور فلسطین ہمیں دلوانے کا وعدہ کریں۔ اس وقت برطانیہ بھی عالمی قوت تھی۔ آدھی دنیا سے زیادہ پر اس کی حکمرانی تھی اور بڑی طاقت شمار ہوتی تھی۔

برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور نے 1917ء میں باقاعدہ اعلان کیا کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتے ہیں۔ ان کو وہاں سے نکالا گیا تھا اور ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ جونہی ہمیں حالات پر کنٹرول حاصل ہوا تو ہم فلسطین یہودیوں کو دلوانے میں ان کی مدد کریں گے۔ یہ اعلان بالفور کہلاتا ہے، جو کہ تاریخ میں بالفور ڈیکلیریشن کے نام سے معروف ہے۔ یوں یہودیوں سے برطانیہ کا یہ معاہدہ ہو گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی کوششیں کیں، لیکن خلافت عثمانیہ تیار نہیں ہوئی تو انہوں نے خلافت عثمانیہ کے مد مقابل برطانیہ سے معاہدہ کر لیا اور پھر اس معاہدے پر بات آگے چلی۔

1914ء تا 1918ء جنگ عظیم اول کا دورانیہ ہے۔ اس میں جرمنی کو شکست ہوئی۔ خلافت عثمانیہ بھی جرمنی کے ساتھ تھی تو خلافت عثمانیہ کو بھی شکست ہو گئی۔ ترکی کے بڑے حصے پر متحدہ فوجیں داخل ہو گئیں اور خود ترکی کی خود مختاری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ ترکی سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ ترکی اپنی حدود سے باہر تمام علاقوں کے دعوے سے دستبردار ہو گا۔ ترکی حکومت ترکی دائرے میں رہے گی، اس کے علاوہ جتنے ممالک اس کے صوبے تھے ان سے دستبرداری کا اعلان کروایا گیا کہ ان پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ اس معاہدے پر ترکیہ کی خود مختاری تسلیم کی گئی اور خلافت عثمانیہ بھی 1924ء میں ختم ہو گئی۔

فلسطین پر برطانوی اتحاد کا قبضہ:

جنگ عظیم اول میں اتحادی قوتوں نے فاتحین نے مفتوحین کے علاقے تقسیم کیے تو اس میں برطانیہ نے فلسطین اپنی تحویل میں لے لیا۔ جس کی پلاننگ مکمل تھی تو برطانیہ نے اس کو سنبھال لیا اور پھر 1920ء سے لے کر 1945ء تک فلسطین برطانیہ کی نو آبادی اور اس کی کالونی تھی۔ برطانوی نمائندہ ہائی کمشنر وہاں حکومت کرتا تھا۔ برطانیہ نے فلسطین کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد خلافت عثمانیہ کے دور میں جو قانون تھا کہ یہودیوں کو فلسطین میں جگہ خریدنے کی اجازت نہیں ہے، وہ قانون منسوخ کر دیا اور اجازت دے دی کہ دنیا بھر میں جہاں سے بھی یہودی آنا چاہیں ان کا حق ہے۔ وہ فلسطین کی زمین خرید سکتے ہیں، مکان بنا سکتے ہیں اور رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔ اعلان بالفور کے وعدے کے مطابق کہ ہم فلسطین یہودیوں کو واپس دلوائیں گے برطانیہ نے فلسطین پر قبضے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ انہیں وہاں کی زمین خریدنے کی اجازت دے دی۔

فلسطینی زمین کی فروخت کے متعلق جید علماء کرام کا فتوٰی:

اس دوران جب یہودی دنیا کے مختلف حصوں سے وہاں جا کر فلسطینیوں سے زمینیں خرید رہے تھے اور فلسطینی بیچ رہے تھے، اس وقت فلسطین کے مفتی اعظم مفتی سید امین الحسینیؒ تھے۔ آپؒ صدر ایوب خان کے زمانے میں پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے فتویٰ صادر کیا کہ یہودیوں پر فلسطین کی زمین بیچنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہودی یہ جگہ خرید کر یہاں آباد ہونا چاہتے ہیں، آباد ہونے کے بعد یہاں اپنی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور بیت المقدس مسلمانوں سے چھیننا چاہتے ہیں۔ لیکن فلسطینی قوم نے اس فتوٰی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس دور میں برصغیر کے بزرگوں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی ان کی تائید میں فتوے دیے۔

اگر یہ تفصیل پڑھنا چاہیں کہ علماء برصغیر کا اس میں کیا کردار تھا تو حضرت تھانویؒ کی کتاب ”بوادر النوادر“ جو ان کے مختلف رسائل کا مجموعہ ہے اس میں ایک مستقل رسالہ فلسطین کے مسئلے پر ہے۔ جس میں انہوں نے بھی مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور دوسرے حضرات کی طرح مفتی اعظم فلسطین کے فتوے کی حمایت کی ہے اور بڑے دلائل کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ فلسطین کی زمین یہودیوں پر بیچنا درست نہیں ہے۔ عالم اسلام کے اور علاقوں سے بھی علماء کرام نے اس فتوے کی تائید کی، لیکن فلسطینیوں نے اس فتوے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

اس فتوے کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا کہ زمین مہنگی ہو گئی۔ دو گنا اور تین گنا قیمت پر زمینیں فروخت ہوئیں۔ دنیا بھر سے یہودی فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ وہ زمین خریدتے، وہاں آباد ہوتے اور مکان بناتے۔ وہ یہودی جو برطانیہ کے قبضے کے بعد فلسطین میں

شاید ایک یا دو فیصد تھے، 1931ء تک ان کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ دس سال میں تقریباً چھ لاکھ یہودی دنیا کے مختلف خطوں سے آکر فلسطین میں آباد ہو گئے تھے اور آباد ہوتے جا رہے تھے۔

فلسطین پر فلسطینیوں کا حق:

اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا مکالمہ ذکر کرنا چاہوں گا۔ میرا ایک دفعہ لندن میں ایک یہودی سے مکالمہ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ یہودی فلسطین چھوڑ جائیں۔ ہمارا موقف تو یہی ہے کہ ہم یہودیوں کو وہاں کا جائز باشندہ تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں وہ فلسطین کو خالی کریں۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ ہم نے تو فلسطین کا بہت سا حصہ پیسے دے کر خریدا ہے۔ تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ ہم وہاں آباد ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جبکہ ہم نے پیسے دیے ہیں، ڈبل ٹرپل قیمت ادا کی ہے اور جگہ خریدی ہے۔ میں نے کہا تم نے خریدی ہوگی لیکن فلسطینی تو دنیا میں دربدر ہیں۔

اس وقت دنیا میں مہاجرین سب سے زیادہ فلسطینی ہیں۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً پچاس لاکھ فلسطینی دنیا کے مختلف کونوں میں مہاجر کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ اگرچہ وہاں سے اچھی زندگی گزار رہے ہیں لیکن مہاجر کی حیثیت سے۔ ان کا سٹیٹس مہاجر اور پناہ گزین کا ہے۔ میں نے کہا فلسطینی دنیا بھر میں دربدر ہیں تو اس نے کہا کہ اگر آپ اپنا مکان مجھ پر بیچ دیں اور مجھ سے پیسے لے لیں تو اس کے بعد آپ کی مرضی ہے جہاں رہیں۔ میرا کیا درد سر ہے، چاہے آپ خیمے میں رہیں یا فٹ پاتھ پر رہیں۔ جب آپ نے اپنی زمین بیچ دی ہے، مجھ سے پیسے لیے ہیں، بلکہ ڈبل پیسے لیے ہیں۔ جب میں نے قبضہ لے لیا تو اب آپ کہتے ہیں کہ میرا مکان واپس کرو۔ اب آپ کو کیوں واپس کروں؟ اب وہ مکان

آپ کا نہیں بلکہ میرا ہے۔ جب میں نے آپ کی رضامندی سے خریدا ہے، زبردستی قبضہ نہیں کیا تو اب آپ کو آباد کرنا تو میری ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ کو مکان بنا کر دوں۔ آپ نے پیسے لے لیے ہیں، اب جائیں۔ میرے پاس اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر میں نے اس کو یہ جواب دیا کہ جو جگہ تم نے خریدی تھی وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو 1967ء کی جنگ میں تم نے زبردستی قبضہ کیا تھا وہ تو خالی کرو۔

اقوام متحدہ کے ذریعے اسرائیلی ریاست کا قیام:

یہودیوں نے اس طریقے سے فلسطین میں اپنی آبادی بنائی اور ایک وقت آیا کہ انہوں نے ایک علاقے میں منصوبے کے مطابق اپنی اکثریت بنا کر اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ یہ علاقہ ہماری اکثریت کا ہے اس لیے ہمیں یہاں حکومت کا حق دیا جائے۔ برطانیہ پہلے ہی ان کا پشت پناہ تھا اور وعدہ کر چکا تھا۔ امریکہ اور روس کی حمایت بھی انہیں حاصل تھی تو اقوام متحدہ نے 1945ء میں فلسطین کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا کہ یہ حصہ اسرائیل کے نام سے الگ ریاست ہوگی اور یہ فلسطین ہو گا۔ اقوام متحدہ نے باقاعدہ یہ تقسیم کی اور اس تقسیم کے مطابق 1948ء میں برطانیہ وہاں سے نکلا اور اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی۔ اس کو امریکہ، برطانیہ، روس اور اقوام متحدہ سب نے تسلیم کیا۔

جب اسرائیل کی ریاست وجود میں آگئی تو اس کے بعد ارد گرد کے ممالک کی اسرائیل سے جنگ ہوئی۔ مصر اور شام نے جنگ کے ذریعے اسرائیل کو ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن عالمی طاقتیں اسرائیل کے ساتھ تھیں تو عربوں کو شکست ہوئی اور اسرائیل کا وجود مستحکم ہو گیا جو باقاعدہ حکومت تسلیم کر لی گئی۔ جس کی فلسطینیوں نے بھی مزاحمت کی، یاسر

عرفات مرحوم اور دوسرے حضرات نے مزاحمت کی، تحریک شروع کی اور فلسطینیوں نے اقوام متحدہ کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ کشمکش چلتی رہی۔

1967ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ:

1967ء میں ایک اور عرب اسرائیل جنگ ہوئی۔ مصر، شام اور اردن ایک طرف تھے، اسرائیل دوسری طرف تھا۔ مصر، شام اور اردن نے مل کر اسرائیل پر حملہ کیا، لیکن اسرائیل نے ان تینوں کو خوفناک شکست دی اور بیت المقدس جو اردن کی تحویل میں تھا، اس پر قبضہ کر لیا۔ اردن سے بیت المقدس چھین لیا، مصر سے صحرائے سینا چھین لیا اور شام سے گولان کی پہاڑیاں چھین لیں۔ 1967ء سے بیت المقدس اسرائیل کے پاس چلا آرہا ہے اور ابھی تک یہ تنازعہ چل رہا ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اسرائیل آزاد خود مختار حکومت ہے۔ عالمی قوتیں اس کی پشت پر ہیں۔ یورپی یونین، امریکہ اور روس اس کے ساتھ ہے۔ فلسطین ابھی تک آزاد ریاست تسلیم نہیں کیا جا سکا، حالانکہ اقوام متحدہ نے 1945ء میں تقسیم کر دیا تھا کہ یہ حصہ فلسطین کے نام سے الگ ریاست ہو گی اور یہ حصہ اسرائیل کے نام سے الگ ریاست ہو گی۔

اقوام متحدہ نے فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ (1) ایک حصہ یہودی اکثر آبادی پر مشتمل اسرائیل۔ (2) دوسرا فلسطین۔ (3) اور تیسرا متنازعہ علاقے کے طور پر اردن کی تحویل میں۔ بیت المقدس نہ اسرائیل کو دیا اور نہ فلسطین کو، بلکہ عارضی طور پر اردن کی تحویل میں دے دیا کہ اس کا فیصلہ بعد میں بین الاقوامی سطح پر کریں گے۔ اب جو اسرائیل کا باضابطہ نقشہ ہے اس میں بیت المقدس اسرائیل کا حصہ نہیں، بلکہ اردن کا حصہ ہے۔ بیت المقدس متنازعہ سمجھا جا رہا ہے، اقوام متحدہ بھی اسے متنازعہ ہی کہتی ہے، جس کا فیصلہ ہونا باقی

ہے۔ اس دوران اسرائیل نے اسے دارالحکومت قرار دینے کا اعلان کر دیا کہ بیت المقدس ہمارا دارالحکومت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ملکوں کے سفارت خانے دارالحکومت میں ہوتے ہیں تو اس پر عالم اسلام نے احتجاج کیا اور کہا کہ جو ملک بھی اپنا سفارت خانہ وہاں لے جائے گا، ہم اس کے بارے میں پالیسی طے کریں گے کہ اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔

اسرائیل کے بارے میں عالم اسلام کا موقف:

شروع میں تمام عالم اسلام کا ایک ہی موقف تھا کہ اسرائیل ایک ناجائز ریاست ہے، اس کو قائم رہنے کا حق نہیں ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے اور فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کو واپس ملنا چاہیے۔ یہ عالم اسلام کا متفقہ موقف تھا، لیکن اس وقت عالم اسلام اور عالم عرب اسرائیل کے حوالے سے دو کیمپوں میں تقسیم ہے۔

1۔ ایک کیمپ جس میں پاکستان، سعودی عرب، ایران اور کچھ اور ممالک بھی ہیں، یہ سرے سے اسرائیل کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہمارے پاسپورٹ میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ پاسپورٹ اسرائیل کے لیے کارآمد نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسرائیل کو جائز ریاست تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اسے ناجائز ریاست سمجھتے ہیں۔ صدر صدام حسین مرحوم کو جب پھانسی دی گئی تو اس کی وجوہات میں عراق کے مقامی مسائل بھی تھے، لیکن مشرق وسطیٰ کے حوالے سے وہ اسرائیل کا سخت ترین مخالف تھا، یہودیوں کا دشمن اور فلسطینیوں کا سخت حامی تھا۔ جب صدام حسین کو پھانسی دی جا رہی تھی تو اس کی زبان پر آخری جملہ یہ تھا کہ اس نے اعلان کیا: فلسطین فلسطینیوں کا ہے، پھر اشھد ان لا الہ الا اللہ تک کلمہ پڑھا تھا کہ رسی کھینچ دی گئی اور وہ شہید ہو گیا۔ چنانچہ ایک موقف یہ ہے کہ

فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کا ہے، یہود نے غاصبانہ اور ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔ اسرائیل کی ریاست ناجائز ریاست ہے۔

2۔ لیکن ہمیں یہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بہت سے مسلم ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں۔ ترکی، مصر، اردن، قطر اور شام نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے اور ان سے امریکہ نے تسلیم کرایا تھا۔ جب مصر کے علاقے پر قبضہ ہوا تو امریکی صدر جمی کارٹر نے کیمپ ڈیوڈ (خیمہ داؤد) میں مصر، شام اور اردن کے مذاکرات کروائے۔ ان کا آپس میں سمجھوتہ ہوا، اور انہوں نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا کہ ہم اسرائیل کو ایک جائز ریاست تسلیم کرتے ہیں۔ ان ممالک کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی ہیں۔ لیکن جو ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔

ان کا موقف یہ ہے کہ اسرائیل اس حد تک ایک جائز ریاست ہے جو اقوام متحدہ نے 1945ء میں تقسیم کی تھی اور فلسطین کو تقسیم کر کے دو آزاد ریاستیں بنائی تھیں۔ وہ اسرائیل کو ان شرطوں کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ اسرائیل نے 1967ء میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ ان سرحدوں سے واپس چلا جائے اور بیت المقدس فلسطین کے پاس ہی رہے گا۔ 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے جو اردن کے حصے پر، شام کی گولان کی پہاڑیوں پر اور بیت المقدس پر قبضہ کیا ہے، یہ ان ممالک کے ہاں بھی ناجائز قبضہ ہے۔ وہ اس علاقے کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔

تاہم سعودی عرب، پاکستان اور دیگر کچھ ممالک نے فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کا وجود تسلیم نہیں کیا۔ ان کا موقف یہی ہے کہ فلسطین فلسطینیوں کا حق ہے، جو ان کو واپس ملنا چاہیے۔ لیکن یہ کشمکش عالمی سطح پر جاری ہے اور اسرائیل اپنی من مانیوں پر لگا ہوا ہے۔

میں موقف کا فرق اس لیے واضح کر رہا ہوں کیونکہ بعض دوست پوچھتے ہیں کہ اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کوئی واضح قدم کیوں نہیں اٹھا رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے جو ہمیں سمجھنی چاہیے۔ جب یہ اکٹھے بیٹھتے ہیں تو موقف کے فرق بلکہ تضاد کی وجہ سے کوئی اجتماعی حکمت عملی نہیں طے ہو پاتی۔

امریکہ: اسرائیل کا سب سے بڑا سہارا:

امریکہ اسرائیل کا سب سے بڑا سرپرست ہے اور یہ امر واقع ہے۔ اللہ رب العزت نے یہود کے بارے میں قرآن مجید میں بیسیوں باتیں فرمائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے: ضربت علیہم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس کہ یہودی اب قیامت تک ذلیل ہی رہیں گے، ہاں اللہ کی رسی تھام لیں یعنی مسلمان ہو جائیں یا دنیا کی کسی طاقت کا سہارا لے لیں۔ آج بحبل من الناس کا منظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ اسرائیل کا سب سے بڑا سہارا بنا ہوا ہے اور اس حد تک سہارا بنا ہوا ہے کہ پوری دنیا کی اجتماعی رائے کو رد کر کے امریکہ یہودیوں کی حمایت میں اور بیت المقدس پر یہودیوں کا استحقاق جتانے کے لیے بڑی مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہے۔ حتیٰ کہ امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے اعلان کر دیا کہ ہم اپنا سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کریں گے۔ سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا باضابطہ دارالحکومت تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بین الاقوامی معاہدات میں بھی اور عالم اسلام کے ہاں بھی متنازعہ ہے۔ تاہم آج اسرائیل امریکہ اور یورپی یونین کے سہارے اپنا اقتدار قائم رکھے ہوئے ہے۔ اگر امریکہ اور یورپی یونین پیچھے ہٹ جائیں تو اسرائیل عربوں کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

امریکہ میں یہود کا اثر و رسوخ:

اس حوالے سے یہ بات بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جو قومیں جدوجہد کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور جدوجہد کرتی ہیں تو پھر دنیا میں ان کے لیے آگے بڑھنے کے مواقع رہتے ہیں۔ یہودیوں نے جو یہ موجودہ پوزیشن حاصل کی ہے، اس کے لیے انہوں نے کیا حکمت عملی اختیار کی تھی۔ ذرا ان کی حکمت عملی پر غور کریں۔ میں نے بتایا کہ 1897ء میں باسل کے مقام پر سویٹزر لینڈ میں یہودیوں کی عالمی کانگرس ہوئی تھی، جس میں انہوں نے اپنی حکمت عملی طے کی تھی۔ ایک اسرائیل کا قیام اور دوسرا عالمی معیشت پر کنٹرول۔ اس سے پہلے یہودیوں کو کسی ایک محلے کی معیشت پر بھی کنٹرول نہیں تھا۔ یہ امر واقع ہے۔ ذاتی طور پر پیسے ان کے پاس بہت تھے، لیکن دنیا کے کسی خطے میں کسی معاشی نظام میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہودی جنگ عظیم اول کے بعد، اعلان بالفور اور برطانیہ کی حکومت سے معاہدے کے بعد دنیا کے معاشی نظام میں داخل ہوئے ہیں کہ ہم تمہارے جنگی اخراجات برداشت کریں گے تم ہمارا قومی وطن تسلیم کرو۔ اس راستے سے یہ معاشی نظام میں داخل ہوئے۔

امریکہ میں یہودی تقریباً ایک فیصد ہیں۔ آج سے سو سال پہلے یہودیوں کی کیفیت امریکہ میں بالکل ایسے ہی تھی جیسی اس وقت پاکستان میں قادیانیوں کی ہے۔ ان کے خلاف نفرت تھی، کوئی انہیں منہ لگانے کو تیار نہیں تھا، ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کے پاس پیسہ اور شرارتی ذہن تھا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے اس فارمولے کے تحت جو صہیونزم کی پالیسی طے کی، اس میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم نے امریکہ میں اپنی نئی نسل کو تیار کر کے مختلف شعبوں میں اوپر کی سطح پر لانا ہے۔ جس کے لیے انہوں نے تعلیم پر توجہ دی اور طے کیا کہ ہم اگلی نسل کو پڑھائیں گے۔

چنانچہ سائنس، ٹیکنالوجی، معیشت، سیاست، سوشیالوجی اور سماجیات اور دیگر فنون اگلی نسل کو پڑھانے کے ساتھ ایک ایک کر کے مختلف شعبوں میں داخل کرتے گئے اور انہیں تقریباً نصف صدی لگی ہے کہ امریکہ میں میڈیا، معیشت، بیوروکریسی اور اقتدار کے تمام اہم مراکز قبضہ کر لیا ہے۔ اس وقت امریکہ میں جو پالیسی ساز ادارے ہیں ان میں غالب اکثریت یہودیوں کی ہے۔

امریکہ میں یہودیوں کی مزاحمت بھی ہوئی ہے، ان کے خلاف بڑی آواز اٹھتی رہی ہے۔ میں نے فوڈ انڈسٹری کا صنعتی شہر "ڈیٹرائٹ" دیکھا ہے، جو یہودیوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے میں سب سے آگے تھا۔ کام کرنے والے پھر کام کرتے ہیں۔ صرف مخالفت کام کرنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑا کرتی۔ کام کرنے والوں کا بگاڑ کام کرنے سے ہوتا ہے۔ یہودی بڑھتے گئے حتیٰ کہ اس وقت پوزیشن یہ ہے کہ امریکہ کی معیشت، میڈیا اور پالیسی سازی یہودیوں کے کنٹرول میں ہے۔ امریکہ کا صدر قانوناً عیسائی ہوتا ہے، یہودی نہیں ہو سکتا، لیکن یہودیوں کی مرضی کے بغیر وہ ایک پتہ بھی نہیں ہلا سکتا۔ انہوں نے ایسے جال تنا ہوا ہے۔ اس پر بطور مثال ایک جملہ نقل کرنا چاہوں گا تاکہ بات سمجھ میں آئے۔

یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت:

ہمارے ہاں جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت تھی۔ قادیانی ان کے خلاف بہت باتیں کرتے ہیں۔ جب بھٹو مرحوم پھانسی سے پہلے جیل میں تھے تو فوج کی طرف سے کرنل رفیع ان کے نگران تھے۔ کرنل رفیع نے اپنی یادداشتیں چھاپ دی ہیں کہ بھٹو مرحوم جیل میں کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ یادداشتیں اس حوالے سے دیکھنے کی ہیں۔ بھٹو مرحوم نے کرنل رفیع سے کہا رفیع! احمدی لوگ

میرے بارے میں کہتے ہیں کہ میں جو جیل میں ہوں اور پھانسی کا حکم ہو چکا ہے تو میری مصیبت ان کی وجہ سے ہے کہ میں نے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا ہے۔ لیکن بات سنو، میں نے تو بڑا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ جب وہ ہمارے پیغمبر ﷺ کو آخری پیغمبر نہیں مانتے، تو میں انہیں کیسے مسلمان کہتا؟ کرنل رفیع کہتے ہیں کہ ان کی زبان سے یہ جملہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ رفیع! میں تو گنہگار آدمی ہوں۔ شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے۔

میں اپنی بات کرتا ہوں کہ بھٹو مرحوم کا یہ جملہ پڑھنے کے بعد میں نے بھٹو کے خلاف بات کرنی چھوڑ دی ہے کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ کس کی کونسی بات پسند فرمالیں۔ جو بات میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بھٹو مرحوم نے کہا رفیع! تمہیں معلوم ہے کہ احمدی پاکستان میں کیا چاہتے ہیں؟ یہ پاکستان میں وہی پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ امریکہ کا کوئی فیصلہ یہودیوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ پاکستان کی پالیسیوں کا کنٹرول ایک اقلیتی گروہ کے ہاتھ میں چلا جائے۔

میں نے یہودیوں کا طریقہ واردات، طریقہ کار اور جس طریقے سے وہ اس وقت دنیا کی معیشت میں آگے آئے ہیں، میڈیا کنٹرول کیا ہے، اسرائیل بنایا ہے اور اب دنیا سے لڑ رہے ہیں، اس کا ذکر کیا۔ نتیجہ جو بھی ہو لیکن جہاں تک ان کی محنت کی بات ہے انہوں نے نصف صدی محنت کی ہے اور نصف صدی کی پلاننگ، تعلیم اور محنت کے ساتھ انہوں نے دنیا میں جو مقام حاصل کیا ہے، میں اس پر کہا کرتا ہوں کہ جدوجہد میں یہودیوں کو دیکھو کہ کیسے جدوجہد کی جاتی ہے۔

میں جب پہلی مرتبہ 1987ء میں امریکہ گیا تو مجھ سے وہاں کے مسلمانوں نے پوچھا کہ ہم یہاں کیا کریں؟ میں نے کہا وہی کریں جو یہودیوں نے کیا ہے۔ جدوجہد، طریقہ کار اور محنت میں یہودیوں کا طریقہ اپناؤ۔ دشمن تو دشمن ہوتا ہے، لیکن دشمن کے طریقہ واردات، جدوجہد اور اس کی محنت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس کے طریقہ کار سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے کہ اس میں بھی سبق ہوتا ہے۔

☆☆☆